# حدیث افتراقِ امت

(۴)

از جناب مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی ندوۃ المصنفین دہلی

فرقۂ ناجیہ کی تحقیق ما انا علیہ واصحابی — الجماعۃ — السواد الاعظم

درحقیقت یہی وہ مسطر ہے جس کو سرورِ کونین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے تیار کیا تھا کہ صفحاتِ عالم پر آئندہ عقائد واعمال کی جب کوئی سطر کھینچی جائے تو وہ اسی مسطر سے برابر کرلی جائے۔ مضمونِ بالا مطالعہ کرنے کے بعد اب یہ فیصلہ کرنا آپ کو آسان ہوگا کہ وہ جماعت کونسی ہے جس کو معیارِ حق وباطل قرار دیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ وہ راسخ العلم جماعت ہے جو نہ تو الفاظ کی جکڑبندیوں میں اتنی مقید ہے کہ عقل کو بالائے طاق رکھدے نہ عقل کے گھوڑے پر ایسی سوار ہے کہ آنکھ بند کرکے علم سلف کو پامال کرتی چلی جائے بلکہ علمِ صحیح اور فہمِ صحیح کی روشنیوں میں اس طریق کا پورا احترام رکھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا طریق تھا۔ اس راہ مستقیم پر نہ تو اختلافات کی کھائیاں ہیں اور نہ بغض وعناد کی پہاڑیاں بلکہ یہ وہ راہ ہے جس کے دن رات دونوں برابر ہیں لیلہا کنہارہا سوار۔

اختلاف کی تشریحات پڑھنے کے بعد اب یہ یقین کرلینا آپ کو آسان ہوگا کہ صحابہ کی جماعت میں کوئی اختلاف نہیں تھا وہ صرف فروعی مسائل میں جہاں ضروری سمجھتے اجتہاد کرلیتے تھے ان کے دور میں عمل ہی کا چرچا تھا اس لئے ایک مکمل دین کے جو طے شدہ مسائل تھے وہی مشغلہ ان کے لئے کافی تھا۔ فرضی مسائل، ذات وصفات کے مباحث سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا اگر دین کے عملی حصہ کو صرف عمل کے لئے دیکھا جائے تو وہ آج بھی اتنا ہی مختصر اور صاف نظر آئیگا مگر افسوس تو یہ ہے کہ دورِ فتن نے بدنصیبی سے ہمارے

حصہ میں عمل کی بجائے اختلاف کا مشغلہ لگا دیا ہے۔

**اختلاف امتی رحمۃ کی تشریح**

یہ ایک ضعیف الاسناد حدیث ہے[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اس کی شرح میں علماء کے مختلف خیال ہیں قاسم بن محمد فرماتے ہیں۔

"کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے عملی اختلاف میں ہمارا یہ بڑا فائدہ رکھا ہے کہ اب اگر کوئی شخص ان میں کسی کے مطابق بھی عمل کرلے تو اس کے لئے اتنی گنجائش نکل آئی ہے۔"

ابن وہب اس کی مزید تشریح نقل فرماتے ہیں:۔

"قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ مجھے خلیفہ عادل عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ قول بہت پسند ہے کہ: مجھکو یہ تمنا نہیں ہوتی کہ صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا اگر کہیں مسائل دینیہ میں ایک ہی قول ہوتا تو بعض صورتوں میں لوگوں کے لئے وہ عملی تنگی کا باعث ہو جاتا لیکن اب ان کے اختلاف سے دین میں عمل کی مختلف راہیں نکل آئیں چونکہ وہ ہمارے مقتدی ہیں اس لئے اب اگر ان میں کسی کا قول اختیار کر لیا جائے تو وہ بھی دین کی ایک سنت پر عمل سمجھا جائیگا۔"[2]

اس کا بظاہر حاصل یہ ہے کہ صحابہ کرام چونکہ زیر سایۂ نبوت تربیت یافتہ تھے۔ شریعت کے اغراض و مقاصد کو پوری طرح سمجھنے اور رعایت کرنے والے تھے اس لئے ان کے اختلاف کی وجہ سے ایک عمل کی جو مختلف صورتیں پیدا ہوئیں وہ سب دین ہی کی راہیں کہلائیں گی اور سب مقبول ہونگی اگر ان کے اختلاف کی بدولت ہمارے سامنے یہ مختلف صورتیں نہ آتیں اور ایک عمل کی ایک ہی

---

[1] صاحب مقاصد حسنہ فرماتے ہیں کہ حدیث "اختلاف امتی رحمۃ" کو بیہقی نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں مرفوعاً روایت کیا ہے۔ طبرانی اور دیلمی اور ضحاک نے اس کو منقطع طور پر روایت کیا ہے۔ عراقی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف مرسل ہے۔ خطابی کے کلام سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ حدیث بے اصل نہیں۔ بیضاوی کے حاشیہ میں ہے کہ اس حدیث کو سبکی وغیرہ نے ذکر کیا ہے مگر محدثین کے طبقہ میں یہ حدیث معروف نہیں (الموضوعات ص ۹۱) ان چند نقول سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کا سندی پایہ کمزور ہے تاہم بے اصل بھی نہیں۔

[2] الاعتصام ج ۲ ص ۱۴۶

صورت ہوتی تو بعض حالات میں اسی ایک صورت پر عمل کرنا دشواریوں کا موجب بن سکتا تھا۔ اس بنا پر ان کے اختلاف کے رحمت ہونے کا مطلب دین میں عملی وسعت ہوگا۔ امام شاطبیؒ کو یہاں ایک اور دشواری پیش آگئی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی کج فہم اس کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ حسب خواہش وہ جب چاہے، جس صحابی کا قول چاہے اختیار کر سکتا ہے یہ بالکل غلط ہے اس لئے فرماتے ہیں۔

"یہ بات طے شدہ ہے کہ شریعت کے ہر ہر مسئلہ میں جزئی جزئی مصلحت کے علاوہ ایک کلی مصلحت بھی ہے۔ جزئی مصلحت تو خاص اس مسئلہ کی دلیل اور حکمت سے ظاہر ہوتی ہے لیکن کلی مصلحت یہ ہے کہ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اعتقادی، قولی، عملی ہر پہلو میں آئین شریعت کا مقید رہے اور ایک سانڈ کی طرح آزاد نہ رہ سکے اس کی ہر ہر نقل و حرکت شریعت کے اشاروں پر ہو۔" [1]

اس کے بعد پھر قاضی اسمٰعیلؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے اختلاف سے جو وسعت ہم کو حاصل ہوئی ہے وہ دین میں اجتہاد کرنے کی وسعت ہے کیونکہ ان کا اختلاف اس کی دلیل ہے کہ غیر منصوص مسائل میں انھوں نے اجتہاد کیا ہے اور اس اجتہاد ہی کی وجہ سے ان میں اختلافات پیدا ہوئے۔ اختلاف کے رحمت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحابہ کے مختلف افعال میں ہر شخص کو بے دلیل اپنی مرضی کے مطابق انتخاب کا حق حاصل ہو گیا ہے۔" [2]

"ابن عبدالبر نے قاضی اسمٰعیل کی رائے پسند کی ہے اور اپنی کتاب جامع بیان العلم میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔" [3]

قاضی اسمٰعیلؒ کا مطلب یہ ہے کہ گوناگوں واقعات اور مختلف حوادث کے لئے ہمیشہ نص صریح کا ملنا تو دشوار ہے اس لئے امت کے لئے دینی مسائل میں اجتہاد کرنا ایک ناگزیر مسئلہ تھا جس کے لئے

---

[1] الموافقات ج ۴ ص ۱۳۱۔ [2] ایضاً ج ۴ ص ۱۳۲۔ [3] ج ۲ ص ۸۷ تا ۹۲)

متاخرین امت کو ابتدائی قدم اٹھانا بہت مشکل ہوجاتا جب صحابہ کرام میں اختلافات ہوئے اور معلوم ہوا کہ یہ اختلافات ان کے اجتہاد کی وجہ سے پیدا ہوئے تو اب امت کے لئے بھی اجتہاد کا جواز نکل آیا، یہی وہ رحمت ہے جس کی طرف اختلاف امتی رحمۃ میں اشارہ کیا گیا ہے اگر ان میں یہ اختلافات نہ ہوتے تو یہ ثابت ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ ہم سے پیشتر امت نے دین کے باب میں اجتہاد کیا ہے یا نہیں ان حالات میں ہمارے لئے سرِ نو اجتہاد کا دروازہ کھولنا بہت مشکل تھا ادھر اجتہاد کرنا مشکل، اُدھر ہر جزئی مسئلہ میں نصِ صریح ملنا ناممکن۔ پھر دین کی مشکلات حل ہوتیں تو کیونکر ہوتیں۔ صحابہ کرام کے اختلاف نے ہماری یہ مشکل حل کردی اور اب عملی طور پر ہمارے لئے اجتہاد کا اسوۂ حسنہ ثابت ہوگیا۔ اختلاف کے رحمت ہونے کا یہ مطلب غلط ہے کہ ہر شخص کو اپنے اہوار کے موافق صحابہ کے اقوال میں انتخاب کرلینے کا حق حاصل ہے کیونکہ اس کا مطلب تو بالفاظِ دیگر یہ ہے کہ شریعت کی کسی پر کوئی گرفت ہی نہیں کیونکہ بعض مرتبہ مسائل فروعیہ میں اختلاف نفی واثبات کا اختلاف ہوجاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کا کوئی عمل نفی واثبات کے دائرہ سے عقلاً باہر نہیں رہ سکتا پس اگر اس تقدیر پر ہر شخص کو صحابہ کے افعال میں انتخاب کا حق حاصل ہوجائے تو اس کا جو عمل بھی ہوگا وہ یقیناً شریعت کے دائرہ میں کہلائے گا اور شریعت کا وجود وعدم برابر ہوجائے گا۔ اور آپ معلوم کرچکے ہیں کہ یہ سرے سے شریعت کے مقاصد کلیہ کے بالکل برخلاف ہے وہ انسان کو اتنا آزاد چھوڑنا پسند نہیں کرتی۔

تلاش کرکرکے صرف شرعی رخصتوں پر عمل کرنا فسق ہے

حافظ ابن حزمؒ اس پر تو اجماع نقل کرتے ہیں کہ شرعی حجت کے بغیر صرف مذاہب کی رخصتوں پر عمل کرنا ناجائز بلکہ فسق ہے۔ [1]

بہرحال صحابہ کرام کے اختلافات دیکھکر اختلافِ امت کے رحمت ہونے کا مطلب خواہ صرف جواز اجتہاد کی حد تک ہو یا امت کے سامنے ایک عمل کی مختلف صورتوں کی وسعت بھی اس کے مفہوم میں داخل رہے۔ دونوں صورتوں میں صحابہ کرام کے اختلاف کی نوعیت، دوسری جماعتوں کے اختلاف کی نوعیت سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ہر شخص کو مختلف اقوال میں

---

[1] الموافقات ج ۴ ص ۱۳۴۔

حسب دلخواہ انتخاب کا حق حاصل نہیں، اس کے ضوابط و قواعد مستقل ہیں۔ ہماری غرض یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ صحابہ کرام میں اصولاً تو کوئی اختلاف ہی نہ تھا ہاں فروعی اختلاف تھا مگر وہ ہمارے لئے باعثِ رحمت ہوا نہ کہ باعثِ تفریق و زحمت۔

مجتہدینِ امت کا اختلاف

مجتہدین کے دور تک عمل کی گاڑی اسی طرح مشترکہ طور پر کھنچتی رہی۔ شدہ شدہ بے علمی کا دور آیا۔ ادھر تکوینی طور پر کچھ اہلِ علم کسی خطہ یا جماعت میں روشناس ہوگئے۔ بے علم جماعتوں نے ان سے مسائل پوچھنا شروع کئے پھر معاصر علما نے ان کا علم، خلوص و دیانت آزماکر ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ اس طرح ایک زمانہ دراز تک اہلِ علم اور غیر اہلِ علم کی متفقہ آواز نے ان کو دنیا میں ایک غیر معمولی حیثیت دیدی ان کے فروع و اصول مکمل طور پر قلمبند کئے گئے اور بحث و تحیص کے تسلسل سے دیگر مجتہدین کے بالمقابل ان میں ایک خاص امتیاز پیدا ہوگیا اور اپنے اپنے دائرۂ تلمذ کے مطابق ان کا مذہب اس مجموعی صورت میں پھیلتا رہا۔

تدوینِ دین میں فطری ارتقاء

فطری ارتقا، احساسِ ضرورت، اور جذباتِ خدمت، کی بنا پر جس طرح قرآن صحف سے مصحف، مصحف سے مصاحف، اور مصاحف سے اعراب و سور و رکوعات کے مدارجِ ارتقائی طے کرتا چلا آیا اور بلاشبہ ان ارتقائی منازل کے بعد یہ قرآن وہی قرآن تھا جو دورِ اول میں موجود تھا۔

سنت میں ارتقاء

اسی طرح سنت کے بھی ارتقائی دور ہیں، گو قرآن و سنت کے مراتب کے لحاظ سے عملِ انسانی کو یہاں کچھ زیادہ آزادی حاصل ہوئی اس لئے وہ دورِ صحابہ سے گذر کر دورِ مجتہدین میں اور منضبط ہوئے پھر اس انضباط میں کچھ اور ترقیات ہوئیں اور ایک زمانہ تک حدیث و فقہ ایک ہی جگہ مدون چلتی رہی۔ اسی احساسِ ضرورت نے پھر مجبور کیا کہ دونوں فن علیحدہ علیحدہ کردیئے جائیں شروع میں صرف یہ قدم بھی نیا اور قابلِ اعتراض معلوم ہوا، آخر کار اس کے فوائد دیکھکر تمام دنیا نے اس کو مانا اور تمام علما کی یہی متفقہ پالیسی بن گئی۔

فقہی ارتقاء

اس فطری ارتقاء اور تکوینی اسباب کے ماتحت لاکھوں اہلِ علم اور کروڑوں انسانوں میں

یہ دین بہ حیثیتِ مجموعی سفر کر رہا ہے اب تمہیں اختیار ہے کہ اس کا نام تم شافعیت و حنفیت رکھ کر دنگل قائم کر دو، یا اسے انحطاطِ دور کے لحاظ سے قدرت کی ایک اعانت تصور کر لو، جس نے تمہاری سہولت کے لئے، تمہاری ضرورت کے بقدر مرتب شدہ دین تمہارے گھروں تک پہنچا دیا ہے۔

**حنفیت و شافعیت کے اختلاف کی حقیقت**

حنفیت و شافعیت کا اختلاف بھی دین میں کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے نہ یہ اختلافِ اہوار پر مبنی ہے نہ اتباع تشابہات کا نتیجہ ہے، نہ علمِ سلف سے بے خبری اس کی بنیاد ہے بلکہ "اختلاف امتی رحمۃ" کا وہ حصہ ہے جو ہر زمانہ میں بقدر ضرورت امتِ مرحومہ میں تقسیم ہوتا رہا ہے۔ اگر نااہلوں اور بے علموں نے اس کو پارٹی بندی کا ذریعہ بنا لیا ہے تو یہ قصور اُن کا ہے۔

**ما انا علیہ واصحابی کی تحقیق**

اس کے بعد ہمیں عنوانِ بالا پر غور کرنا ہے۔ بظاہر یہاں آپ کا جواب سوال کے پورا پورا مطابق نظر نہیں آتا۔ صحابہ کا سوال فرقۂ ناجیہ کے متعلق تھا آپ کا صاف جواب "انا واصحابی" ہونا چاہئے تھا یعنی وہ جماعت میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ بلاشبہ اُس وقت فرقۂ ناجیہ کا مصداق یہی جماعت تھی اور اگر اس سے بڑھ کر کوئی آئین کی بتانا مقصود تھا۔ تو وہ کتاب و سنت ہے بلکہ "ما انا علیہ واصحابی" کا حاصل بھی یہی ہے پھر آپ کے اصحاب کا طریقہ آپ کے طریق کے سوا کوئی اور طریق نہیں تھا اس کے مستقل طور پر بیان کرنے کی ضرورت معلوم ہونی چاہئے۔

ان سوالات کے حل کی طرف جب انسان توجہ کرتا ہے تو اس کو صاحبِ نبوت کے ایک ایک لفظ کا کمال کھلتا چلا جاتا ہے بیشک متبادر یہی تھا کہ جواب "انا واصحابی" ہوتا مگر یہاں سائل کا مقصود اس کے زمانہ کی جماعتِ حق کی تعیین نہ تھی وہ دورِ فتن میں حق جماعت کی تعیین کا طالب تھا اگر اسے آپ صرف کتاب و سنت ہی کا معیار بتاتے تو یہ جواب اُس دور کے مناسب حال نہ ہوتا جس میں ہر باطل سے باطل فرقہ کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہی کتاب و سنت کا حامل ہے اس لئے یہاں آپ نے وہ فیصلہ کن آئین بتانا چاہا ہے جو اس زمانہ کے بھی مناسب حال ہو، وہ صرف کتاب و سنت نہیں بلکہ اُس کی وہ عملی تصویر ہے جو آپ نے اپنے صحابہ کے سامنے بطریق

اسوہ پیش فرمائی تھی، صحابہ کرام نے اُس کے ایک ایک خط و خال کو دیکھا اور موبہو اس کی نقل کی۔ اب ادھر یہ اسوۂ حسنہ اُدھر اس کا وہ مکمل نقشہ تھا۔ پوچھنے والوں کے لئے اس سے زیادہ صاف بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ جو صراطِ مستقیم کو دریافت کرنے آتا اُسے آنکھوں سے دکھا دیا جاتا اور زبان سے سمجھا دیا جاتا کہ وہ صراطِ مستقیم یہ ہے اس لئے یہاں افراد و اشخاص کی بحث چھوڑ کر اُن اوصاف کو بتا دیا گیا ہے جو فرقۂ ناجیہ کی تعیین میں ہمیشہ کے لئے کارآمد ہوں۔

**الفاظ میں احتمالات باقی رہتے ہیں اس لئے فیصلہ کن ان کی صورت عملی ہے**

اس جواب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دورِ فتن میں کچھ ایسا تعصب نمودار ہو جاتا ہے کہ اُس زمانہ کی کٹ حجتی ختم کرنے کے لئے صرف الفاظ کافی نہیں ہوتے، یہاں حقیقت و مجاز، عموم و خصوص کے احتمالات پیدا کر دینے کا سہارا باقی رہتا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوٹوک عمل ہی وہ کھلی ہوئی شریعت ہے جس میں یہ احتمالات نہیں چلتے۔ اسی لئے دورِ فتن کا بنیادی مسئلہ اسی تفصیلی شریعت کا انکار ہوا کرتا ہے۔ قرآن کریم سے زیادہ لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں اور حدیث سے زیادہ فقہ کا

**صحابہ کرام پر آپ کا مکمل اعتماد**

رہا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی سنت کو یہاں مستقل حیثیت کیوں دی گئی ہے تو اس کی وجہ بظاہر اس کامل اعتماد کا اظہار کرنا ہے جو آپ کو اپنے صحابہ کی فہم پر حاصل تھا۔ صحیح احادیث میں موجود ہے کہ بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں کسی مافوق العادت امر کا تذکرہ ہوتا جیسے حیوانات کا تکلم تو آپ نے ابوبکرؓ و عمرؓ کی غیر حاضری میں یہ کلمات فرما دیئے ہیں "آمنت انا و ابوبکر و عمر" میں اور ابوبکرؓ و عمرؓ بھی اس پر ایمان لائے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کی طرف سے ان کے ایمان کی شہادت دینا یہ اُن پر کمال وثوق کی طرف ہی اشارہ تھا۔

**صحابہ کے بعض افعال کی صورت گو عہدِ نبوت میں نہ ملے مگر وہ مقاصدِ شریعت کے ماتحت ہوتے ہیں**

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے بعض اعمال کی صورت گو دورِ سنت میں ہمیں نظر نہ آئے مگر مقاصدِ شریعت کے لحاظ سے اس کا عین شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے لیکن دورِ فتن میں صحابہ کے متعلق یہ حسنِ ظن قائم رہنا مشکل ہے۔ اس لئے اس بحث کو ختم کرنے کے لئے ان کے طریق کو ایک مستقل حیثیت دیدی گئی ہے

مثال کے طور پر تراویح کا مسئلہ ہے۔ کون نہیں جانتا کہ تراویح کی یہ اجتماعی صورت جو آج ہمارے دور میں رائج ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہ تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس اجتماعی صورت کو شروع کیا۔ اس وقت طبائع میں کتنی سلامتی، کتنا اتحاد، کتنی یکسوئی، کتنا انقیاد تھا کہ سب نے اس کی اتباع کی اور کوئی اختلافی ہنگامہ برپا نہ ہوا۔ بات یہ تھی کہ یہ درست تھا کہ تراویح کا یہ دور آپ کے زمانہ میں نہ تھا مگر صحابہ کرام کو معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس التزام جماعت کے ساتھ تراویح نہ پڑھنے سے جو بات مانع آئی تھی وہ صرف یہ کہ ماہِ رمضان کا مبارک مہینہ، نزولِ وحی کا دور موجود، اس میں صحابہ کرام کا پرخلوص اجتماع اگر اسی طرح مسلسل ہوتا رہا تو اس کا بہت امکان تھا کہ یہ اجتماعی ہیئت جواب تک اختیاری تھی آئندہ لازم قرار نہ دیدی جائے اور جب ان بادہ نوشوں کا دور ختم ہو تو آئندہ جام و سبو کی یہ گردش کہیں بار نہ ہو جائے اس لئے حضرت عمر فاروقؓ کو جب دیگر مہماتِ اسلام سے فرصت ملی تو فوراً تراویح کے باجماعت ادا کرنے کی ترغیب دی کہ اب وحی بند ہو چکی تھی۔ اور وجوب کا کوئی احتمال نہ تھا اس کی ایک مثال نہیں بہت سی مثالیں ہیں کہ صحابہ کے دور کا کوئی عمل گو صرف اپنی صورت کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نظر نہ آئے لیکن حقیقت کے لحاظ سے آپ کے منشار کے اتنا مطابق ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف فرما ہوتے تو یہی فرماتے یہ ہمارا حسن ظنی نہیں بلکہ عہد مبارک میں۔

**قرآن کا حضرت عمرؓ کی رائے کی تصویب کرنا ان کے دینی مزاج شناسی کی دلیل تھی**

خود وحی الٰہی کی حضرت عمرؓ کی بار بار تصویب کرنا اس بات کی کھلی ضمانت تھی کہ آئندہ بھی ان کی اصابت رائے امت کو تسلیم ہونا چاہیے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے زمانہ میں ہوتے تو موجودہ بے احتیاطیوں کو دیکھکر عورتوں کا مسجدوں میں آنا بند کر دیتے اس اختلاف صورت اور اتحاد مقصد کے پیش نظر مناسب ہوا کہ "ما انا علیہ" کے ساتھ ساتھ "واصحابی" کا لفظ اور اضافہ کر دیا جائے۔

**منصب تشریع اور منصب اجتہاد کی تقسیم**

خالق نے اپنے رسول کو منصب تشریع سے نوازا تھا۔ اس کے

رسول نے اپنے صحابہ کو منصبِ اجتہاد سے نواز دیا اور اس طرح جو نعمت رسول کے حصہ میں آئی تھی امت کا بھی اس میں ایک حصہ لگ گیا۔

**السواد الاعظم - الجماعۃ -**

ان الفاظ کی تفسیر میں صاحب اعتصام نے متعدد اقوال نقل فرمائے ہیں ہمارے خیال میں حدیث کے گذشتہ الفاظ ہی اس کی تشریح کے لئے کافی ہیں یعنی جماعت اور سوادِ اعظم سے وہی جماعت اور وہی سوادِ اعظم مراد ہے جو ما انا علیہ واصحابی (یعنی کتاب وسنت کی متبع) ہے۔ اگر ان ہر سہ الفاظ کا خلاصہ نکالو تو یہ ہوگا کہ اہلِ حق ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہو اور نہ صرف یہی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے طریق کا بھی احترام کرنے والی ہو اگر کوئی جماعت صرف آپ کے طریقہ کا احترام کرتی ہے لیکن صحابہ کے طریق کا احترام نہیں کرتی تو وہ ان الفاظ کے حدود سے باہر ہے دورِ فتن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے مابین تفریق کا عقیدہ بھی ظاہر ہو چکا ہے۔

**خدائے قدوس اپنے اور اپنے رسول کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا اور رسول اپنے اور اپنے صحابہ کے مابین تفریق کا روادار نہیں**

اللہ تعالیٰ اپنے اور رسول کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا اسی طرح رسول اپنے اور اپنے صحابہ کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا۔ درحقیقت یہ انتہائی نادانی اور کجروی ہے کہ جو جماعت امت اور اس کے رسول کے درمیان واسطہ ہے، اس کے اقوال وافعال کو ہم تک پہنچانے والی ہے، اسی پر اعتماد نہ کیا جائے۔ اگر خدا کا رسول خود اپنی حیات میں ان پر اعتماد کر چکا ہے، بادشاہوں سے اور قبائل کفار سے گفت وشنید اُن ہی کی معرفت کی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ امت ان پر اعتماد نہ کرے۔ ایک عالمگیر دین جس جماعت سے نکلتا ہے اگر وہی جماعت ناقابلِ اعتماد ہے تو پھر آئندہ دور میں اُس دین کا خدا حافظ۔

**اسوۂ صحابہ کی اہمیت**

اسی اہمیت کے پیشِ نظر الفاظِ بالا میں صحابہ کرام کی سنت کو ایک مستقل حیثیت دیدی گئی ہے ورنہ جس طرح رسول کا طریقہ خدا تعالیٰ کے طریقہ سے علیحدہ نہیں ٹھیک اسی طرح صحابہ کی سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے علیحدہ نہیں اس لئے فرقہ ناجیہ کی ایک

بڑی علامت یہ ہے کہ وہ ان دونوں طریق کی جو بہ حقیقت ایک ہی ہیں اپنے اپنے مرتبہ میں بزرگی و احترام کی قائل ہو بلکہ اس پر گامزن بھی ہو۔ خوارج نے صرف سنتِ رسول کو لیا اور صحابہ کی ایک جماعت کو کافر ٹھیرایا یہی ان کے ناحق ہونے کی پہلی علامت تھی اور اسی کی طرف حضرت ابنِ عباسؓ نے بھی اپنے کلام میں اشارہ فرمایا تھا۔

حواریین اور صحابہ کرام کا مقابلہ

عیسائیوں کو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت سے مقابلہ کرتے میں ناکامی رہی۔ اسی طرح حواریین اور آپ کے صحابہ کرام کے مقابلہ میں بھی ناکامی رہی ہے بلکہ ان کو حسرت ہے کہ اگر کہیں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حواری بھی آپ کے صحابہ کی طرح جانباز اور اتنے ہی فداکار ہوتے تو اس طرح مسیحی دین صدیوں گمنامی کے عالم میں پڑا نہ رہتا۔

ہجرت کے چھٹے سال صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جب عروۃ قریش کی جانب سے شرائطِ صلح پر گفتگو کے لئے آتا ہے تو جن الفاظ میں صحابہ کی وفاداری کا نقشہ اس نے خود قریش کے سامنے کھینچا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک کافر کے قلب پر اس کا کتنا گہرا اثر پڑا تھا وہ کہتا ہے۔

"کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں لیکن جو والہانہ عقیدت کا منظر یہاں دیکھا، کہیں نہیں دیکھا جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو گردنیں جھک جاتی ہیں اور محفل پر ایک سکوت کا عالم طاری ہوجاتا ہے۔ نظر بھر کر کوئی شخص ان کی طرف دیکھ نہیں سکتا۔ آپ کے وضو کا پانی اور آپ کا بلغم زمین پر گرنے نہیں پاتا کہ وہ اُسے ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں اور اپنے چہرہ اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں"

اسی لئے اس قوم کا احساسِ خودداری و وفاشعاری کی داستانیں پڑھنے والے مسلم و کافر اس پر متفق ہیں کہ اس سے زیادہ اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت دنیا کی کسی قوم نے پیش نہیں کیا۔

صحابیت کا احترام نجات کی علامت ہے

الغرض چونکہ ایک صحابیت کے احترام ہی کا مخالف ہونا مقدر تھا اس لئے فرقۂ ناجیہ کی ایک بڑی علامت صحابیت کا وقار و احترام بھی قرار دیدیا گیا ہے

جو اُس کا احترام نہیں کرتا وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا احترام نہیں کرتا۔ [۱]

**شانِ اجتماع حق کی بینت ہے**

دوسری علامت جماعت کے لفظ سے یہ مفہوم ہوتی ہے کہ ان میں شانِ جمعیت و وحدت نمایاں ہونا چاہئے۔ افتراق و تشتت بغض و عناد اُن سے دور دور رہنا چاہئے اور سوادِ اعظم کے لفظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ افراد ایسے موقر ہونا چاہئیں کہ ان کا وجود ایک جماعت کی شکل میں بھاری باشوکت اور بارعب نظر آئے۔

چنانچہ عبداللہ بن مبارک سے جب دریافت کیا کہ وہ جماعت کون ہے تو جواب میں ابوبکرؓ و عمرؓ سے شروع کرکے محمد بن ثابت اور حسین بن واقد کے دور تک پہنچ گئے جب ان سے کہا گیا کہ ان حضرات کی تو وفات ہوگئی تو فرمایا کہ پھر ابوحمزۃ السکری[۲]۔ [۳]

**افراد کی اکثریت معیارِ صداقت نہیں**

یہ ایک بہت ہی عامیانہ خیال ہے کہ سوادِ اعظم سے صرف افراد کی اکثریت مراد ہے غور کرنا چاہئے کہ دورِ فتن میں اہلِ حق کی اکثریت کب ہوسکتی ہے۔ پھر اس اکثریت کو ہر حق و باطل کے فیصلہ کا شرعی معیار قرار دیدینا اور بھی نافہمی ہے۔ اگر آج ایک طرف بے دینی، دہریتہ مذہبی حریتہ، فواحش و منکرات کی اکثریت موجود ہے تو کیا اس کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو سوادِ اعظم کا معزز لقب دیکر فرقۂ ناجیہ کا مصداق ٹھہرا لے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح اختلاف کی بحث میں بتایا جاچکا ہے کہ اختلاف سے عقائد کا اصولی اختلاف مراد ہے۔ اسی طرح "ما انا علیہ واصحابی" میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے عقائد کے اصول ہی مراد ہیں، ہر بحث و جدل کے موقعہ پر اس حدیث کو پڑھنا درحقیقت حدیث کی توہین کرنا ہے۔ حدیث لا تجمع امتی علی ضلالۃ اگر بلحاظِ سند درست ہو تو اس کی مراد بھی یہی ہے کہ امت پر کوئی دور ایسا نہیں آئے گا کہ اس میں حق پر کوئی باقی نہ رہے اور سب گمراہی پر متفق ہوجائیں بلکہ ایک جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔ یہاں بھی اکثریت کا فیصلہ مذکور نہیں ہے۔ دنیا میں اکثریت ہمیشہ حق کے خلاف ہوتی ہے مگر اس کی حقانیت کی یہ دلیل ہے کہ غلبہ آخر کار اسی کو حاصل ہوتا ہے۔

---

[۱] دیکھو مقدمۃ اصابۃ فصل ثالث۔ [۲] ان کا اسم مبارک محمد بن میمون مروزی ہے۔ [۳] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۲۲۶۔

اسی مضمون کو صحیح بخاری میں بالفاظ دیگر یوں ارشاد فرمایا ہے۔

لن تزال هذه الامة قائمة على الله

لا يضرهم من خالفهم حتى يأتي امر الله

حدیث لن تزال کا مصداق

روایتِ بالا میں هذه الامة کا لفظ ہے مگر عمرو بن ھانی کی روایت میں "طائفة من امتی" اور یزید بن اصم کی روایت میں "عصابة من امتی" کا لفظ ہے جس کا یہ منشا ہے کہ یہ اوصاف جمہور امت کے نہیں بلکہ اس امت میں صرف ایک طائفہ وجماعت کے اوصاف ہیں۔ بلکہ ابن حزم تو یہ کہتا ہے کہ طائفہ لغتِ عرب میں بعض شئے کو کہتے ہیں اس لئے طائفہ کا اطلاق ایک شخص پر بھی آسکتا ہے۔

والطائفة فی لغة العرب يقع على الواحد فصاعداً ۔ [۱]

امام بخاری جزم کے ساتھ فرماتے ہیں کہ وہ طائفہ اہلِ علم کا طائفہ ہے اور امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ اہلِ حدیث ہیں۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ امام احمد کی مراد اہل سنت ہیں ان تینوں الفاظ کا خلاصہ ایک ہی ہے۔ اہلِ حدیث اور اہلِ علم اور اہل سنت ایک ہی معنی کی مختلف تعبیریں ہیں بعض نافہم اس کو بھی اختلاف سمجھ لیتے ہیں۔ صاحب موافقات نے جلد رابع میں اس پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے

اقوال مفسرین اور الفاظ شارحین حدیث میں اکثر اختلاف عبارت ہوتا ہے اُسے اختلاف حقیقت نہ بنانا چاہیے۔

ما كان ظاهره الخلاف وليس فی الحقيقة كذلك واكثر ما يقع ذلك فی تفسير الكتاب والسنة فتجد المفسرين ينقلون عن السلف فی معانی الفاظ الكتاب اقوالا مختلفة فی الظاهر فاذا اعتبرتها وجدتها تتلاقی ۔ [۲]

یعنی جہاں ظاہر میں اختلاف نظر آئے اور درحقیقت اس میں کوئی اختلاف نہ ہو، یہ صورت زیادہ تر کتاب وسنت کی تشریحات میں نظر آتی ہے تم دیکھو گے کہ مفسرین قرآنِ کریم کے الفاظ کی شرح میں مختلف تعبیرات نقل کرتے ہیں لیکن جب ان کو بغور ملاحظہ کرو گے تو ان سب کا نقطہ نظر ایک ہی بات ہو گی صرف الفاظ مختلف ہوں گے۔

---

[۱] الاحکام فی اصول الاحکام ج ۱ ص ۱۰۹ ۔ [۲] ج ۱ ص ۲۱۴۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اس کو مفصل لکھا ہے۔ دیکھو توجیہ النظر۔

بہرحال یہ ایک طویل بحث ہے ہم نے یہاں ضمنی فائدہ کے طور پر صرف تنبیہ کردی ہے کہ اگر اس کو پورے طور پر سمجھ لیا جائے تو دین میں اختلافات کا بہت بڑا باب جو ہماری نافہمی سے اختلاف کی صورت میں نظر آرہا ہے بند ہوجاتا ہے۔ ماانا علیہ واصحابی۔ الجماعۃ۔ السواد الاعظم۔ اسی سلسلہ کی ایک مثال ہے۔ یہاں بھی سواد اعظم اور جماعۃ سے وہی طائفہ مراد ہے جس کو مذکورہ بالا روایت میں ذکر کیا گیا ہے اُس طائفہ کے اوصاف پر غور کرنے سے اس کے سوادِ اعظم فرمانے کی وجہ بھی ظاہر ہوجاتی ہے۔ حدیث بالا یہ کہتی ہے کہ مختلف رکاوٹوں اور ناسازگاری ماحول کے باوجود وہ جماعت خدا کے دین پر قائم رہے گی اور بلحاظ اپنے عزم واستقلال دوسروں پر اتنی بھاری ہوگی کہ مخالفین کی مخالفت ان کو اپنے جادۂ مستقیم سے ہٹا نہ سکے گی۔ گویا اگر ایک طرف تکوینی طور پر فرقہ منحرفہ کی پیکثرت رہے گی تو دوسری طرف ایک طائفہ ایسا بھی ضرور باقی رہے گا جو اقلیت میں ہوکر بھی اپنی شانِ جمعیت اور عزم واستقلال کی وجہ سے کبھی اکثریت سے مرعوب نہ ہوگا۔ [۵]

---

[۵] نبوۃ ختم ہوچکی اس لئے امت کو عام گمراہی سے محفوظ رہنا چاہئے

جس امت میں نبوت ختم ہوچکی ہے اُس امت میں نبوت کی خدمات انجام دینے کے لئے ایک طائفہ مقدر ہونا چاہئے جو ان فرائض کو انجام دیتا رہے اور جس طرح کہ نبی وقت تن تنہا ہونے کے بعد بھی کفر کا مقابلہ کیا کرتا ہے اب اس جماعت کو باطل کا مقابلہ کرنا چاہئے اور جس طرح کہ تمام روئے زمین کی مخالفت اُسے اپنی جگہ سے ایک انچ جنبش نہیں دیسکتی اسی طرح زائغین اس طائفہ کے قدم بھی دینِ متین سے متزلزل نہیں کرسکتے

طائفہ میں امتی کا وجود جماعتی شکل پر ہونا ضروری نہیں ہے

حافظ ابن حجر تصریح فرماتے ہیں کہ اس طائفہ کا ایک جگہ ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے بلکہ جو افراد بھی اپنی اپنی جگہ منتشر طور پر احیاءِ سنت میں مشغول ہوں وہ شرعی نظر میں سب ایک جماعت اور اسی طائفہ کے افراد کہلائیں گے۔ لہٰذا یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ اجتماعی شکل میں کسی گوشہ یا کسی خاص خطہ میں یکجا موجود ہوں۔

مجددین کی اجمالی تشریح

جیسا کہ ہر صدی پر مجددین کی آمد کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ مجدد کا فرد واحد ہونا ضروری ہے بلکہ ہوسکتا ہے کہ دین کی مختلف ضروریات کی تجدید شخصِ واحد کی بجائے ایک طائفہ سے حاصل ہوجائے اور یہ حیثیتِ مجموعی یہی طائفہ مجددین کہلائے (دیکھو فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۵۲)

اب سوچو کہ فرقۂ ناجیہ کی اس سے زیادہ صاف تشریح اور کیا ہو سکتی تھی اور اسی لئے جب تک عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ باقی رہا یہ اختلافات بھی رونما نہ ہوئے لیکن جونہی کہ آپ کا عہدِ باسعادت

---

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) یہ تو واقعی بھی ایک مصیبت عظمیٰ ہے کہ عوام اور بعض خواص خود اپنی جانب سے کسی حدیث کی کوئی شرح سمجھ لیتے ہیں اور جب اس کے خلاف کوئی حقیقت سامنے آتی ہے تو اس سے کان کھڑے کرنے لگتے ہیں حالانکہ وہ بات اپنی جگہ بالکل صاف ہوتی ہے۔

**امت کا پہلا مجدد**

بعض اشخاص پر مجدد کے لقب کی شہرت نے یہ تخیل پیدا کر دیا ہے کہ مجدد گویا بزرگی کا کوئی منصب ہے حالانکہ امت نے سب سے پہلے یہ لقب خلیفہ عادل عمر بن عبد العزیزؒ کے لئے استعمال کیا تھا۔ پھر اس کے بعد امام شافعیؒ کے متعلق کہا گیا ہے اسی طرح آئندہ بھی تخمینی طور پر یہ لقب جاری رہا ہے۔ بہرحال مجددین کے لئے نہ دعویٰ کرنا ضروری ہے نہ اس کا ایک فرد میں انحصار ضروری ہے بلکہ آخری دین کی یہ مختلف اصلاحی صورتیں ہیں جو تکوینی طور پر، کبھی اجتماعی اور کبھی انفرادی، صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ مجدد دین۔ طائفۃ من امتی۔ ما انا علیہ واصحابی ہے۔ السواد الاعظم سب اسی کے شعبے ہیں بات ایک ہے لفظ مختلف۔

**اصلاح دین کا تکوینی نظام**

صحیح بخاری میں اس روایت کے ایک لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کا وجود تکوینی ارادہ کے ماتحت ہے۔ اختلاف کے نئے سے نئے شاخسانے دنیا میں رونما ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی نئی سے نئی تدبیر قدرت پیدا کرتی رہے گی اسی خیر و شر کے ہنگامہ کا نام عالم اختلاف ہے جسے دنیا کہتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| من یرد اللہ بہ خیراً یفقہ فی الدین | جس کے متعلق خدا خیر کا ارادہ کرتا ہے اُسے |
| ولن یزال امر ھذہ الامۃ مستقیما | دین میں سمجھ دیدیتا ہے اور اس امت کا دین ہمیشہ |
| حتی تقوم الساعۃ الخ | مستقیم رہے گا یہانتک کہ قیامت آجائے گی۔ |

**دین کی استقامت کے لئے دین کی سمجھ ضروری ہے**

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ تفقہ فی الدین ارادۂ الٰہیہ کے ماتحت نصیب ہوتا ہے، کسب کا ثمرہ نہیں اسی طرح دین کی استقامت کی راہیں بھی تکوینی ہیں۔

بے شک جس دین میں ختم نبوت مقدر ہو چکا ہے اس میں بقاء استقامت کی بشارت اور اس کے تکوینی انتظامات کی خبر بھی ضروری امر تھا۔

کرمانی شارح بخاریؒ فرماتے ہیں کہ الفاظِ بالا سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ استقامت میں تفقہ فی الدین داخل ہے اور اسی ارتباط کی وجہ سے حدیث میں دونوں باتیں ایک سیاق میں ذکر کی گئی ہیں۔

(فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۵۰)

اور صحابہ کا دورِ مسعود ختم ہوا تو "ما انا علیہ واصحابی" کی وہی کھلی ہوئی بات اب ایک معمہ بن کر رہ گئی حتی کہ جس قدر اس زمانہ کو بعد ہوتا گیا اختلافات کی خلیج اسی قدر زیادہ وسیع ہوتی گئی۔ لہٰذا ہر باطل سے باطل اور منحرف سے منحرف بھی دعویٰ کر رہا ہے کہ ما انا علیہ واصحابی کا مصداق وہ ہے لیکن اب وہاں نہ صحابہ ہیں نہ ان کے دور کے دیکھنے والے کہ اس نزاع کا فیصلہ ہو جاتا۔ ایک جماعت خدا کی صفات کی ہی سرے سے منکر ہے اور خالص توحید اسی کا نام رکھتی ہے معتزلہ مدعی ہیں کہ اہل توحید و عدل وہی لوگ ہیں مشبہ چیخ رہے ہیں کہ صفات پر صحیح ایمان صرف ان کو حاصل ہے اور ہر ایک کے پاس دلائل میں وہی قرآن و سنت ہے غرض ہر ایک کا گمان یہی ہے کہ فرقہ ناجیہ اسی میں منحصر ہے بہرحال صحیح صورتِ عمل مخفی ہونے کے بعد اب یہ مشرح الغاظ بھی صرف ایک رسّی کٹی کا میدان بنے ہوئے ہیں اسی کو سورۂ روم میں ارشاد فرمایا تھا۔

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ہر پارٹی اپنے اپنے خیال میں مست ہے۔

منحرف جماعتیں دعوی حقانیۃ میں دلیر ہوتی ہیں

گویا منحرف جماعتوں کا یہ بھی ایک خاصہ بن کر رہ جاتا ہے کہ غور و تفکر کی بجائے انھیں صرف اپنی حقانیت کا زعم باطل ہو جاتا ہے۔ عالم اختلاف کی یہ ہنگامہ آرائی دیکھکر تقدیر ہنستی ہے اور کہتی ہے۔ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ۔ یعنی یہ اختلاف اسی طرح باقی رہے گا اور بساطِ عالم کو اسی اختلاف کے لئے بچھایا بھی ہے۔

حدیث قرطاس میں ایک اونکی تنبیہ

اسی لئے شاید وفات کے وقت کوئی ایسی بات آپ لکھتے لکھتے رہ گئے تھے اگر کہیں وہ لکھدی جاتی تو امت میں مستقل اختلاف کا خطرہ مٹ جاتا۔

هلم اكتب لكم كتابا لاؤ تمہارے لئے ایک ایسی بات لکھدوں کہ

لن تضلوا بعده اس کے بعد پھر کبھی گمراہ نہ ہو سکوگے۔

اگر کہیں یہ کتاب قیدِ کتابت میں آجاتی تو ممکن تھا کہ امت کی امت لا یزالون مختلفین سے نکل کر سب الا من رحم ربك کے نیچے داخل ہو جاتی مگر آخر کار تقدیر غالب آئی اور ایسے حالات

رونما ہو گئے کہ یہ تحریر وجود میں نہ آسکی۔ [1]

**تقدیر ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی تمناؤں کا ساتھ نہیں دیتی**

ایک مرتبہ آپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ شب قدر کا صاف صاف علم بتا دیا جائے مگر مسجد نبوی میں کچھ شور بپا ہو گیا آخر وہ علم بھی اسی طرح مستور رہ گیا یہاں بھی کچھ قصد مبارک تھا کہ لاؤ کوئی ایسی بات بتلا دی جائے کہ آئندہ تفرقہ کا اندیشہ ہی نہ رہے مگر یہاں بھی کچھ شور ہو گیا آخر کار وہ نوشتہ جوں کا توں رہ گیا۔ عالم تقدیر و تکوین کا یہ تماشہ بھی قابل دید ہے کہ اگر کبھی عالم تدبیر نے کبھی وحدت و اجتماع کے لئے زور لگایا بھی تو اسی وقت پردۂ غیب کے کسی اندرونی ہاتھ نے اس کا سارا کھیل بکھیڑا برباد کر دیا ہے۔ یہاں پہنچکر قلم بھی خاموش ہو جاتا ہے۔ قلم اینجا رسید سر بشکست۔

**تقدیر اسباب کے پردہ میں نمایاں ہوتی ہے**

خیر و شر دو متضاد قوتیں ہیں جب ایک ابھرے گی تو دوسری مغلوب ہو جائیگی قدرت خود انھیں زیر و زبر کیا کرتی ہے۔ بندۂ اسباب یہاں شکست و فتح کی دھن میں لگا رہتا ہے وہاں یہ منظور ہی نہیں کہ میدان کسی فریق کے بھی یکطرفہ ہاتھ آجائے اس لئے شکست و فتح کا ڈول باری باری کھنچتا ہی رہتا ہے اور یہ بازی اس وقت تک برابر کھیلی جائے گی جب تک کہ عالم اختلاف کو آباد رکھنا ہے ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض۔

گویا نظام قدرت کی طرح یہ بھی اس کا ایک نظام ہے کہ وہ صوامع و بیع و مساجد کے اختلاف کو بساط عالم پر بچائے رکھے اور اگر کوئی طاقت اس کے برخلاف ابھرے تو اس کے مقابلہ کے لئے خود سامنے آکر ان کو ایسے حدود پر روک دے جس کے بعد کسی کے مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہونے لگے اس اختلاف کی آبادی کے لئے دنیا مشغول جنگ رہتی ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ جنگ اسباب موت ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ اسباب بقا یہی ہے ہاں اگر قدرت کا ہاتھ نہ ہوتا تو اب تک ایک پارٹی نے غلبہ پاکر دوسری کو فنا کر دیا ہوتا اور چونکہ عالم اختلاف کی فطرت کے خلاف اس کو جینے کا حق نہیں ہے اس لئے اُسے بھی فنا ہونا پڑتا

یہ واضح رہنا چاہئے کہ عالم تشریع و عالم تقدیر کے مابین ہمیشہ مطابقت ضروری نہیں ہے۔

---

[1] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۱۴۸۔

حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام برادرانِ یوسفؑ کو چشم زخم سے لگنے کی تدابیر کئے جائیں گے مگر تقدیر نے جس کے مقدر میں جیل خانہ لکھ دیا ہے وہ جیل جا کر رہے گا۔

**حدیث کی صاف صاف تشریح کے بعد اختلاف عالم تکوین کے ماتحت ہے**

الحاصل اگر "ما انا علیہ واصحابی" کے صاف صاف بات ہونے کا آپ یہ مطلب سمجھے تھے کہ اس فیصلہ کے بعد اختلاف کا تخم ہی دنیا سے مٹ جائے گا تو آپ نے غلط سمجھا تھا اور اگر شریعت کے سر یہ الزام رکھنا چاہتے ہیں کہ اس نے فرقہ ناجیہ کی کوئی صحیح تفسیر نہیں کی تو یہ اس سے زیادہ غلط سمجھے ہیں۔ عالم تشریع بصائر یعنی کھلی کھلی باتیں آپ کے سامنے بیان کرتا رہے گا۔ مگر عالم تکوین شبہات کے گرد اڑا اڑا کر اس کو تاریک و مکدر بناتا رہیگا آپ سلسلۂ اسباب میں راہِ حق تلاش کرنے کی تگ و دو جاری رکھئے اگر آپ کا نام "الا من رحم ربک" میں درج ہو چکا ہے تو جو راہ سب سے زیادہ صاف آپ کو نظر آئے گی وہ یہی "ما انا علیہ واصحابی" کی راہ ہوگی اور خدانہ خواستہ اس فہرست میں آپ کا نام نہیں ہے تو ایک تنکہ بھی آپ کو پہاڑ معلوم ہوگا۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ — سو جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا
صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ — ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے اور جس کو چاہتا ہے کہ
اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا — گمراہ کرے کر دیتا ہے اس کے سینہ کو بے نہایت تنگ
حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ۔ — گویا وہ زور سے چڑھتا ہے آسمان پر۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تدبیر کو چھوڑ کر آپ کو تقدیر کے حوالے کرنا چاہتے ہیں بلکہ اختلاف کا مفہوم، اس کے اسباب فرقہائے منحرفہ کی شناخت، پر تا مقدور بحث کر کے آخر میں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہاں اختلاف کے ان اسباب ظاہر کے ساتھ خاص طور پر اس کا ایک تکوینی سبب بھی ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ولذلك خلقهم سے اشارہ فرمایا ہے اور اسی لئے اس افتراق کو دیکھکر یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ حدیث کے قصور بیان کا ثمرہ ہے۔ بیان تو اتنا واضح ہے جتنا کہ ہو سکتا ہے مگر چونکہ خطاب تکلیف علیحدہ ہے اور خطاب تقدیر علیحدہ اس لئے کبھی کبھی ایک صاف بات بھی چیستان بن کر رہ جاتی ہے اگر آج بھی کوئی شخص "ما انا علیہ واصحابی" کی راہ معلوم کرنا چاہے تو اس کے لئے دروازے

کھلے ہوئے ہیں پس اشکال یہ نہیں ہے کہ فرقۂ ناجیہ مبہم ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کے دریافت کے جو اسباب ہیں خواہشِ نفس اس طرف آنے ہی نہیں دیتی۔ بقول اکبر مرحوم

اللہ کی راہیں سب ہیں کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جو بحث یہاں کی گئی ہے وہ خدیثی مذاق کے موافق کی گئی ہے ایک مؤرخ کو حق ہے کہ وہ تاریخ کے مطابق اسباب اختلاف بتائے۔ اصحابِ تاریخ کا خیال ہے کہ ابتداء میں سیاست و مذہب مدغم تھے، اس لئے سیاسی تحریکات سب مذہبی رنگ میں ہی نمایاں ہوتی تھیں اس وقت ان دونوں عناصر کی تحلیل بہت ہی مشکل تھی پھر جب قومیت نے مذہبی جذبات کی روح حاصل کر لی تو اس وقت سے سیاست کو مذہب کا جامہ پہننے کی ضرورت نہ رہی اس لئے مورخین نے مذہبی اختلافات کو سیاسی اختلافات کی بنیاد قرار دیا ہے مگر بنظرِ غور اگر آپ اس بنیاد کی بھی کوئی بنیاد تلاش کریں گے تو وہ یہی اسباب پائیں گے جس کا مذکورہ بالا سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔

---

مولانا ابوالکلام آزاد کی تازہ ترین علمی اور ادبی تصنیف

## غبارِ خاطر

مولانا کے علمی اور ادبی خطوط کا دلکش اور عنبر بیز مجموعہ۔ یہ خطوط موصوف نے قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں اپنے علمی محب خاص نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے تھے جو رہائی کے بعد مکتوب الیہ کے حوالے کئے گئے، اس مجموعے کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ مولانا ابوالکلام جیسے مجمع فضل و کمال کی تالیفات میں اپنے رنگ کی بے مثال تراوشِ قلم ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ کے بعد مصنف کے دماغی پس منظر کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ سطر سطر موتیوں سے ٹکی ہوئی ہے۔ قیمت مجلد خوبصورت گرد پوش چار روپے۔

مکتبۂ برہان دہلی۔ قرول باغ